سوانح حیات

امام الاولیاء حضرت پیر سیّد محمّد عبد اللہ شاہ مشہدی قادری رحمۃ اللہ علیہ

از رشحاتِ قلم:

حضرت سیّد محمد ظفر قادری رحمۃ اللہ علیہ

حضور سلطان الاولیاء، زبدۃ الاصفیاء، امام العارفین، سیّد العاشقین، امامِ شریعت، شہبازِ طریقت، مخزنِ علومِ سبحانی، منبعِ انوارِ یزدانی، واقفِ اسرارِ معنوی، قبلۂ دل و کعبۂ جان، حضرت پیر سیّد محمد عبد اللہ شاہ صاحب مشہدی قادری رحمۃ اللہ علیہ 1898ء بمطابق ۱۳۱۵ ھ کو اس جہان پر تشریف لائے۔ آپ کے آباؤ اجداد راولپنڈی کے علاقے سے نقل وطن کرکے یہاں رونق افروز ہوئے۔ یہ حکایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ حضرت امام

لطیف بری رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے سیّد محمد موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ راولپنڈی سے علاقہ کمالیہ ضلع لائل پور پہنچے۔ اورجس جگہ پر آپ نے قیام فرمایا، وہاں ایک بستی آباد ہوئی جو بعد میں حضرت ہی کے نام سے مشہور ہوئی۔ پھر جناب شیخ کے جدِّ امجد جن کا اسمِ گرامی سیّد قادر بخش تھا، دو بھائی تھے یعنی ایک بھائی سیّد قادر بخش رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرا سیّد عظمت شاہ رحمۃ اللہ علیہ۔ ان دونوں صاحبان نے ایک دوسرے کے قریب قریب اپنی اپنی جائے رہائش بنائی جو بڑھتے بڑھتے گاؤں کی شکل اختیار کرگئے، ان دونوں کے درمیان صرف ایک میل کا فاصلہ ہے۔ گاؤں انہی بھائیوں کے نام پر یعنی عظمت شاہ اور قادر بخش کے نام سے مشہور ہیں۔

قبلہ و کعبہ ہادی راہنما کی پیدائش بھی اسی جگہ ہوئی۔ کتنی مبارک ہے وہ جگہ جہاں خدا تعالیٰ کے قاصد، انبیاء اور اولیاء تشریف فرماہوں۔ مدینہ منورہ

جہاں میرے محبوب محمّد پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رونق افروز ہوئے، ہمارے لیے عرشِ عظیم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور پھر جس جگہ اس محبوبِ حق یعنی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیارے اور چاہنے والے ہوں اور اس شمعِ حقیقی کے پروانے ہوں تو کیا اس مقام کی قدر و منزلت کچھ کم ہوگی؟ نہیں بلکہ اگر بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو بھٹکے ہوئے مسافروں کی منزل اور تکیہ گاہِ عاجزاں ہے۔ جناب کی پیدائش کے وقت آپ کے والدین نہایت تنگی و عسرت میں گزر اوقات کر رہے تھے اور خود حضور نے بھی اپنی عمر کا کافی حصہ اسی حالت میں گزارا۔ کون جانتا تھا کہ اس گدڑی سے بھی لعل نکلے گا؟ کسے خبر تھی کہ اس گھر میں جہاں مفلسی اپنے قدم جمائے ہوئے تھی، ایک ماہِ نورانی چمکے گا جو اپنے نور کی خنک روشنی سے ظلمتِ جہل کو ایک نیا اجالا بخشے گا۔ آج سے چودہ سو برس پہلے جو حالت عرب کی تھی، وہی حالت جناب کے زمانہ میں اس علاقہ میں تھی، یعنی لوگ تو مسلمان تھے لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ اسلام کس چیز کا نام ہے؟ ہندو قوم کے ساتھ رہتے رہتے ہندو تہذیب اِن

میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بالکل انہی کا تاثر لے چکے تھے اور انہی کے توہمات و رواج مسلمانوں نے اپنائے ہوئے تھے، بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ ہندوؤں کے کہنے پر مرضِ چیچک کو دور کرنے کے لیے درختوں کی پرستش کرتے تھے۔ یہ اس علاقہ کی حالت تھی جہاں اعلیٰ حضرت سیّد محمد عبد اللہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قدم رنجہ فرمایا۔

سنّت الٰہیہ ہے کہ جب کوئی قوم حد سے بڑھ جاتی ہے یعنی بہت زیادہ گمراہ ہوجاتی ہے تو ہم اپنا قاصد بھیج دیتے ہیں تا کہ وہ مخلوقِ خدا کو اسی کی راہ پر گامزن کردے، اور انہیں بحرِ ظلمات سے ساحلِ رحمت کی طرف کھینچ لائے۔

خدائے بلند و بالا نے جب ان لوگوں کو حدودِ شرعیہ کو پھلانگتے دیکھا تو اپنے کرم سے یہ آفتاب طلوع فرمایا جس نے ہر زن و مرد کے خانۂ دل کو اپنی نورانی شعاعوں سے منور کرکے اللہ تعالیٰ کی راہ پر ڈال دیا۔

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔ (8)

" اور (اے حبیب ﷺ !) آپ فرما دیجیے حق آگیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل (کہیں بھی ہو، آخر) مٹنے والا ہی ہے ۔"

آپ جب کچھ بڑے ہوئے تو پرانے دستور کے مطابق مسجد ہی سے اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ پورے ضلع میں صرف چند اسکول تھے، اور وہ بھی بڑے بڑے شہروں میں۔ دیہاتی لوگوں کو تو پتہ ہی نہ تھا کہ اسکول بھی کوئی چیز ہے۔ بہر حال آپ نے وہیں مسجد میں ایک دیندار مولوی صاحب سے سلسلۂ تعلیم کا آغاز کیا۔ قرآنِ کریم اور دوسری چھوٹی چھوٹی فارسی کی کتابوں سے لے کر گلستان، بوستان تک تعلیم جاری رکھی۔ ان کے علاوہ بھی چند کتب آپ کی نظروں سے گزریں۔ آنجناب کی تعلیم کے بارے میں بتانے کی

ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ میں آپ کو یہ بتا سکوں کہ علمِ ظاہر اور علمِ باطن میں کیا فرق ہے۔ قبلہ و کعبہ کے علمِ ظاہر کے متعلق آپ جان چکے ہیں۔ اب ذرا غور کیجیے کہ اس قدر قلیل علم اور پھر جناب کی فصاحت و بلاغت کے واعظ اور ایسے ایسے نکات بیان فرمانا کہ علماء بھی دنگ و ششدر رہ جاتے، کیا یہ اِن چند کتابوں کا نتیجہ تھا؟ یہ تو اہلِ نظر ہی جان سکتے ہیں کہ :۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

ایک آیت قرآنیہ کا مفہوم ہے کہ جب میں تم میں سے کسی کو منتخب کرلیتا ہوں تو اس کو اپنا علمِ خاص یعنی علمِ باطنی عطا فرما دیتا ہوں اور وہ نورِ باطن سے ہر چیز کی کیفیت کو بخوبی پا سکتا ہے۔ اور دوستو! جس کو خدا چن لے، میں کون ہوں اس کی تعریف کرنے والا۔ ایک اور بات میرے ذہن میں رہ رہ کر ابھر رہی ہے کہ خدا کے منتخب کرلینے کے معانی ہیں: اپنا ہم راز بنا

لینا کیونکہ ہر وہ فرمان جو ہم تک پہنچتا ہے، تو اِن ولی اللہ یا نبیّ اللہ کی زبان درفشاں سے ہی ہم تک پہنچتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل اللہ اس کے ہم راز بھی ہیں اور اس سے ہم کلام بھی ہیں۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اللہ تعالیٰ کے سوا بظاہر کوئی علم حاصل نہ کیا اور اُمی لقب پایا، لیکن دوستو! وہ کیا چیز تھی جس نے ایران و عراق کو جھکایا اور وہ کون سی پالیسی تھی جس سے روم مشرف بہ اسلام ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی وکالت نہ پڑھی تھی، کوئی ڈگری حاصل نہ کی تھی، کسی کالج میں تعلیم حاصل نہ کی تھی، صرف ایک تھا پڑھانے والا جس کی قرآنِ پاک ببانگِ دہل گواہی دے رہا ہے :

أَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ

عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۔ (9)

” (اللہ) رحمٰن نے (اپنے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قرآن پڑھایا، انسان (کامل ، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پیدا کیا، انہیں (جو ہوچکا یا قیامت تک ہوگا، سب کا) بیان سکھایا۔“

نگارِ من کہ بمکتب نرفت و خط ننوشت
بغمزہ مسئلہ آموزِ صد مدرس شد

” میرا محبوب کبھی مکتب نہیں گیا اور نہ ہی لکھنا سیکھا لیکن اپنی ایک نگاہِ ناز سے سینکڑوں مدرّسین کو مسئلہ حل کرنا سکھا دیا ۔“

امید ہے کہ میرے اس مختصر سے بیان سے آپ پر واضح ہوگیا ہوگا کہ علمِ باطن کیا ہے، اور علمِ ظاہر کیا ہے، اور اِن دونوں علوم میں فرق کیا ہے؟ حضرت شیخ کے یوں تو بچپن کے بہت سے واقعات ہیں مگر میں یہاں دو کا ذکر کرتا ہوں۔

ابھی آپ پانچ برس کے تھے کہ اپنے ننھیال میں تشریف لے گئے۔ گاؤں کے پاس ہی ایک راہٹ تھا۔ اس پر خشک ایندھن کا ڈھیر لگا ہوا تھا، آپ نے اسے آگ لگا دی تو اس انبار سے اس قدر بلند شعلے نکلے کہ گاؤں والے خوف زدہ ہوگئے اور آگ بجھانے کے لیے کنوئیں کی طرف دوڑے مگر جب انہوں نے آپ کو پاس کھڑے دیکھا تو سب نے دریافت کیا کہ یہ آگ تو نے کیوں لگا دی اور ہمارا سارے کا سارا ایندھن جلا دیا؟ آپ نے فرمایا: بھائی میں نے ایندھن نہیں جلایا بلکہ روشنی کی ہے تا کہ اندھیرا دور ہوجائے۔ یہ آثار آپ کے بچپن میں تھے۔ پھر آپ نے اجالا کرکے دکھایا اور ایسی روشنی کی کہ تمام اندھیرا دور ہوگیا، اور نور اللہ سے ظلمتِ شیاطین کو بھگا دیا۔

آپ چھوٹی عمر میں ایسی باتیں کرتے جن کو سن کر آپ کی شخصیت کے بارے میں کچھ اور گمان ہوتا۔ آپ بہت چھوٹے تھے، اس وقت کی ایک حکایت ہے: پینے کے لیے جب آپ پانی مانگتے تو فرماتے کہ برتن بھرا ہوا لوں گا ورنہ نہیں۔ پانی دینے والے لبالب بھر کے دیتے،

لیکن هَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ کی صدا پھر ختم نہ ہوتی۔ آخر اہلِ خانہ بہت تنگ آگئے اور ایک دن حضور کو کنوئیں پر لے آئے اور پانی کے آگے برتن رکھ دیا جو بہت جلد پانی سے بھر گیا اور کہا کہ اب یہ بھر گیا ہے، اٹھا کر پی لو، مگر جواب میں پھر وہی صدائے بازگشت ہوتی۔ چونکہ وہ برتن پہلے سے ہی بھرا ہوا ہوتا اور جو پانی اور آتا، وہ باہر نکل جاتا۔ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی مانگنے والا خاموش نہ بیٹھتا، اور وہی سوال دہرائے جاتا۔ یہ دیکھ کر سب نے کہا کہ اس سائل کے سوال کا جواب ہمارے تو بس کی بات نہیں ہے۔

یہ تشنگئ عشق اس پانی سے کیسے بجھتی، یہ تو بغیر وصالِ حبیب کبھی ختم نہیں ہوتی، مانگنے والا آخر مانگ کے رہا، اور ڈھونڈنے والے نے بالآخر پا ہی لیا۔ جب تک چہرۂ محبوب سامنے نہ ہو، تسکین میسّر آ ہی نہیں سکتی۔

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حُورانِ خلد میں تیری صورت مگر ملے

شروع ہی سے آپ بڑے عابد تھے، اور اذان و جماعت کا بے حد شوق تھا۔ وقت گزرتا گیا، عہدِ شباب آن پہنچا، یہی آتشِ عشق جو لگائے نہیں لگتی اور بجھائے نہیں بجھتی، آپ کو کھینچ کر دربارِ قطبیہ موضع سندھیلیانوالی لے گئی ’ جس جگہ شمع فروزاں ہو، پروانے خود آ ہی جاتے ہیں، اور سلسلہ قادریہ کے شیخِ کامل حضرت سیّد قطب علی شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اور یہی پہلی ملاقات مؤثر ثابت ہوئی یعنی تسکینِ روح حاصل ہوئی اور قبلہ و کعبہ حضرت قطب الاقطاب رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ بیعت ہوگئے۔ دستِ بیعت کے معنی ہوتے ہیں : کسی کے ہاتھ پر بِک جانا، اس لفظ کا صحیح معنی آپ نے بن کر دکھایا۔ جو کچھ گھر میں ملتا، شیخِ کامل کی نذر کردیتے اور فرماتے: یہ سب کچھ جس کا دیا ہوا ہے، اسی کے حوالے کرتا ہوں۔ اسی طرح آمد ورفت بڑھتی گئی، اور آپ کو جس وقت بھی غلبۂ شوق ہوتا، فورًا پیرِ کامل

کے دربار میں پہنچتے۔ سندیلیانوالی اور قادر بخش شریف کا درمیانی فاصلہ بیس میل تھا۔ یہ راستہ آج کے راستوں جیسا نہیں بلکہ آج سے پچاس برس پہلے کا راستہ جب ہمارے علاقہ میں نہر بھی نہیں آئی تھی، بسوں، گاڑیوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بڑا دشوار گزار راستہ تھا، تمام جنگل پرخار تھا، ، دور دور تک پانی کا نشان نہ تھا، ہاں کہیں کہیں کنوئیں ہوتے تھے جن سے پانی میسّر آ سکتا تھا، واہ رے طوفانِ عشق نہ جنگلی درندوں کا ڈر، نہ کانٹوں کی پرواہ۔ آہ! یہ سیلِ محبت بھی انوکھی شئے ہے۔ پھو ل و خار جو بھی آیا، ساتھ بہائے لیے جا رہا ہے۔ کتنا لطف ہے مئے الفت کا جس نے پی، تا دمِ زیست نشہ نہ اترا، اور پھر یہ شراب تو نظروں سے پی جاتی ہے اور پلائی جاتی ہے، یہاں مقدار کا تقاضا ہی نہیں ۔

خمار چیز کی مقدار پر نہیں موقوف
شراب کم ہے تو ساقی نظر ملا کے پلا

جناب کا مؤدب ہونا۔ سبحان اللہ! جب بھی مجلسِ شیخ میں بیٹھتے، اس جگہ بیٹھتے جہاں سب لوگوں کے جوتے پڑے ہوتے تھے۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ دورانِ وعظ جب بھی میں اپنی نظریں چہرۂ شیخ کی طرف اٹھاتا تو ان کی نظریں اپنے چہرہ پر گڑی ہوئی پاتا اور محبوب کو دیکھتے دیکھتے کبھی سیر نہ ہوتا۔

غوثِ زماں حضرت پیر سیّد قطب علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک دن محفل برخاست کرکے اندرونِ خانہ تشریف لے گئے۔ اور جاتے ہی گھر میں تمام اہلِ خانہ کو بتایا کہ ایک سیّد لڑکا ہے جو محفل میں تمام لوگوں کے پیچھے جہاں سب کے جوتے پڑے ہوتے ہیں، وہاں بیٹھتا ہے، مجھے اس قدر پیارا لگتا ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کو دیکھتا ہی رہوں۔ ایسے غوث کی اتنی پیار بھری نظریں اس لیے پڑتی تھیں کہ وہاں ایک خزانہ پنہاں تھا جسے وہ افشا کرنا چاہتے تھے جو کہ بعد میں افشا ہوا اور جس کے اظہار پر لاکھوں لوگوں کو فیض ہوا۔ ایک دن قبلہ و کعبہ دربارِ قطبیہ کی مسجد میں اذان دے رہے تھے کہ اعلیٰ حضرت پیرسیّد قطب علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے آئے اور مسجد

میں باہر کھڑے ہوکر اذان سنتے رہے۔ آپ اذان بہت سریلی آواز میں پڑھا کرتے تھے۔ اعلیٰ حضرت نے تمام اذان وہیں کھڑے کھڑے سنی اور اپنے ایک مصاحب کو ’ جو کہ آپ کے خاص مقرب تھے اور علاقہ کمالیہ ہی کے رہنے والے تھے، فرمایا کہ ”یہ تمہارے علاقہ کے ہیں، ان کا خاص خیال رکھا کرو، اور اپنے ساتھ ہی ان کے کھانے اور سونے کا انتظام کیا کرو۔“

عرض کیا: بہت اچھا، حضور! میں ان کا خاص خیال رکھوں گا، لیکن اگر گستاخی تصور نہ کی جائے تو ایک گزارش کرتا ہوں کہ ہم جو اس نوجوان سے مدّتوں پہلے کے غلام ہیں، یہ ہم سے کون سی زیادہ خاصیت رکھتا ہے کہ جناب اتنا خیال فرماتے ہیں۔ جواب ملا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں، تم نہیں دیکھ سکتے۔ ایک دن آئے گا کہ دنیا اس کے آگے جھکے گی اور تم لوگ اس سے رشک کرو گے۔ یہ جواب سنتے ہی وہ صاحب خاموش ہو گئے۔

بقول ان کے بعد ازاں میں ان کا خیال رکھنے لگا، اپنے ساتھ ہی کھانا کھلاتا اور ساتھ ہی سلاتا۔ غرضیکہ جتنا ہوسکتا تھا، میں ان کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ انہی صاحب کا بیان ہے کہ ایک رات میں اور پیر محمد عبد اللہ شاہ صاحب اکٹھے ایک چارپائی پر سوئے ہوئے تھےکہ مجھے ”ہُو، ہُو“ کی آواز سنائی دی اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے منہ سے لحاف ہٹایا، دیکھا کہ میرا ساتھی خوابِ راحت میں تھا، لیکن یہ آواز تیز تیز ہوتی چلی جارہی تھی۔ میں بڑا حیران ہوا، آخر میں نے لحاف ہٹادیا اور دیکھا کہ ان کے زیرِ پستانِ چَپ جہاں دل ہوتا ہے، ایک سوراخ جس سے یہ صدائے اِلَّا ہُو آ رہی تھی، لیکن جب میں نے ان کے چہرے کو بنظرِ غور دیکھا تو ان کی آنکھیں اور لب بند اور بالکل حالتِ خواب معلوم ہوئی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ پیرِ کامل جو فرمارہے تھے، یہ تو وہی آثار ہیں۔ دوستو! یہ ہے بھی اسی طرح، میں اس کی کوئی تشریح نہیں کرنا چاہتا لیکن اتنا کہوں گا ۔

گوش بند و چشم بند و لب بہ بند
گر نہ بینی سرِّ حق من بخند

” تم غیر اللہ سے اپنے کان، اپنی آنکھ اور اپنے ہونٹ بند کرلو، پھر اگر تم رازِ الٰہی کو نہ پاسکو تو میری بات کا بے شک مذاق اڑانا۔“

آپ کا یہ معمول تھا کہ دربارِ شیخ پر اس طرح رہتے کہ پتہ ہی نہ چلتا تھا، حالانکہ پیر صاحب بہت خیال رکھا کرتے تھے۔ مسجد میں سو رہتے اور لنگر خانے اس وقت جاتے جب کہ سب لوگ کھانا کھا چکتے۔ ان کا بچھا کھچا روٹی کا ٹکڑا جتنا بھی ملتا، تناول فرماتے۔ اللہ والوں کا معاملہ کچھ شروع سے ہی ایسا چلا آ رہا ہے۔ یہاں میں ایک حکایت لکھنا مناسب سمجھتا ہوں۔

ایک اعرابی حضرت سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کے پاس آیا۔ آپ گھر میں موجود نہ تھے۔ حضرت سیدنا امام حسین رضي الله عنه نے ان کو مسجد میں بٹھایا اور بڑا پرتکلف کھانا لے کر آئے۔ جب اعرابی

کھانا کھانے لگا تو حضرت امام حسین رضي الله عنه سے عرض کرنے لگاکہ جناب! میں اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گا جب تک اس آدمی کو ’ جو کونے میں بیٹھا روٹی کے ٹکڑے پانی میں بھگو بھگو کر کھا رہا ہے، کھانے میں شامل نہ کرلوں۔ حضرت امام حسین رضي الله عنه نے جواب دیا: یہ میرے والد حضرت علی المرتضیٰ رضي الله عنه ہیں اور یہ سب کچھ ان ہی کے فیض سے ہے۔ مقامِ غور ہے کہ خلیفۃ المؤمنین کی یہ سادگی ۔ کیا ایسی مثال کوئی پیش کر سکتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں، البتہ وہ لوگ جنہیں آپ اہل الله کے نام سے پکارتے ہیں، ان کے حالات ایسے ہی ہوتے ہیں کیونکہ وہ لوگ حضرت علی کرم الله وجہہ الکریم کے نقشِ قدم پر گامزن ہوتے ہیں۔

تیری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں مین نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

جن کو الله تعالیٰ منتخب فرماتے ہیں، ان کے حالات بچپن سے ہی عوام الناس سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔

پھر ان کا شباب، اس کے بعد ضعیفی، سب کے سب زمانے انوکھے ہوتے ہیں۔

قبلہ و کعبہ کو تیس سال کی عمر میں خرقۂ خلافت عطا ہوا اور آپ نے تبلیغ شروع فرمائی۔ غالباً جو تبلیغ آپ نے فرمائی، شاید ہی کسی ولی اللہ نے کی ہو کیونکہ اکثر کتب میں، میں نے دیکھا ہےکہ ہر فقیر جو وعظ فرماتے تھے، ان کے وقت مقرر ہوا کرتے تھے، مثلاً محبوبِ سبحانی حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہفتہ میں تین بار وعظ فرمایا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ہفتہ میں صرف ایک بار، غرضیکہ سب کے وقت مخصوص تھے، لیکن جناب شیخ کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ آپ کا کام دن رات یہی ہوتا ، صبح نمازِ فجر اور اوراد و تلاوت کے بعد باہر تشریف لے آتے اور آغازِ محفل ہوتا۔ آپ تقریر شروع کرتے اور دوپہر بارہ بجے تک مسلسل تقریر فرماتے رہتے۔ دورانِ وعظ کبھی کسی کو جرأت نہ ہوتی کہ مجلس سے اٹھ سکے یا اجازت لے سکے۔ اور اگر کوئی باہر سے آئے تو دور ہی سے سلام کرکے وعظ میں

شامل ہوجائے کیونکہ اگر کوئی وعظ میں مخل ہوتا تو آپ سخت غصہ کا اظہار فرماتے اور ہونا بھی اسی طرح چاہیے کہ آدابِ محفل ہیں اور اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے :

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ۔ (10)

" اے وہ لوگو جو ایمان لائے (بات کرتے وقت) اپنی آوازوں کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آواز سے اونچا نہ کرو ۔"

یعنی میرے محبوب کی بارگاہ میں اونچا بھی مت بولو۔ یہ آداب کے خلاف ہے۔ القصّہ پھر بعد از نمازِ ظہر وعظ فرنے لگتے تو شام ہوجاتی بلکہ کبھی کبھی تو عشاء تک بھی یہ سلسلہ جاری رہتا۔ پھر یہ نہیں کہ اس کے بعد آپ گھر جا کر آرام فرماتے بلکہ اندر جا کر بھر

ایک گھنٹہ وہاں پند و نصائح فرماتے اور یہ معمول شروع سے لے کر آخر عمر اسی طرح رہا اور آپ نے اس میں ذرّہ بھر فرق نہ آنے دیا۔

شروع میں گزارش کرچکا ہوں کہ یہاں جاہلیت حد سے زیادہ تھی اور اس جہالت کو علم میں بدلنے کا سہرا آپ کے سر ہے۔ دن رات کی تبلیغ ان لوگوں کے لیے بہت مؤثر ثابت ہوئی اور تمام لوگ جوق در جوق آ کر آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوگئے اور وہ رسوماتِ قبیحہ جو یہاں کے باشندوں کو بری طرح گھیرے ہوئے تھیں، ان کا قلع قمع ہوگیا۔ صرف یہی نہیں کہ بری عادتیں لوگوں نے چھوڑ دیں بلکہ قادر بخش شریف اور گرد و نواح کے تمام علاقے ذکر " لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ " سے گونج اٹھے اور پنجگانہ نماز کے علاوہ لوگ تہجد گزار بھی بن گئے۔ یہ درست ہے کہ جب حق آتا ہے تو باطل بھاگ جاتا ہے۔ جہاں نور آجائے، وہاں ظلمت نہیں ٹھہرتی۔
آپ کا یہ اقتدار ان لوگوں کو ایک آنکھ نہ بھایا جو مدّتوں پہلے اس علاقے پر حکمرانی کر رہے تھے۔ وہ

لوگ ہندوؤں میں بھی تھے اور مسلمانوں میں بھی۔
انہوں نے آپ پر ہر طرح کے حملے کیے ، الزام لگائے تا
کہ یہ شان و شوکت مٹی میں مل جائے، لیکن یہ شان و
شوکت تو اس ربِّ لم یزل کی عطا فرمائی تھی، اسے کون
ختم کرسکتا تھا۔ قرآنِ کریم میں بھی آیا ہے :

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـــئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ
اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۔ (11)

" وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے (نبی محمد صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم کی نبوّت کے) نور کو اپنے منہ (کی باتوں)
بجھا دیں مگر اللہ اپنے (نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم کی نبوّت کے) نور کو پورا کیے بغیر مانے گا
اگرچہ کافر (اسے) نہ پسند کریں۔"

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

باطل کے طوفان آئے، آندھیاں اٹھیں لیکن حق کا بال بیکا نہ ہوسکا۔ نمرود نے حق ہی کے مقابلے میں آگ کی چتا تیار کروائی، اور آپ جانتے ہیں کہ حق مسکراتے ہوئے چتا میں داخل ہوگیا۔ خوف ہے تو باطل کو، غم ہے تو باطل کو۔

مریدین و معتقدین کی گزارش پر آپ نے دعوتوں پر جانا شروع کیا۔ یہ دعوتیں ہماری تقریبات یا ہماری عام دعوتوں جیسی نہ تھیں بلکہ یہ اور رنگ کی ہوتی تھیں۔ ہر سال کا آپ کا یہ پروگرام بن گیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم اس پروگرام کو یا اس سفر کو دعوت کا ہی نام دے سکتے ہیں، لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ دعوتیں نہیں بلکہ تبلیغ اور مجاہدہ ہے۔ آپ کہیں گے: بھلا! جہاں پر تکلف کھانے اور پر تپاک خیر مقدم ہو، اسے مجاہدہ کیونکر کہا جا سکتا ہے؟ بجا، مگر یہ خیال صرف اسی صورت میں درست ہے جب کہ دعوتوں کا منتہائے مقصود اکل و شرب اور لہو و لعب ہو، یہاں ایسا نہیں۔

ذرا تفصیلِ پروگرام ملاحظہ ہو: یہ سفر بیس دن سے کم کا نہیں ہوتا اور ہر روز تیس میل سے زیادہ سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ پھر یہ سفر بھی ایسا نہیں کہ آرام سے قطع ہو بلکہ کچی اور ناہموار راہوں پر کچھ لوگ پیدل، کچھ سائیکلوں پر، کچھ گھوڑوں اور یکوں پر یہ سفر طے کرتے ہیں۔ جس گاؤں میں کھانے پینے کا انتظام ہو، وہاں بھی اور راہ میں آنے والے اِدھر اُدھر کے ان دیہاتوں میں بھی جہاں کھانے کا نتظام نہیں ہوتا، محض ٹھہرنا ہی نہیں ہوتا بلکہ ہر مرید کے گھر پر پہنچ کر اس کی دل جوئی کرنا بھی پروگرام کا ضروری حصّہ ہے، خواہ یہ قیام چند لمحوں کے لیے ہو ، اور اس طرح مہینوں کا سفر دنوں میں پورا کیا جاتا ہے۔

اس سے قبل بھی بیان ہوچکا ہے کہ قبلۂ دل و جان کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں آدمی ہوتے مگر آپ ہر غریب، امیر کا برابر خیال کرتے، ان کی سواری، ان کے کھانے پینے اور ٹھہرنے کے انتظامات کی نگرانی فرماتے۔ صاحبِ خانہ صرف جو کچھ چاہتا، پکا دیتا مگر جب قبلہ دعوت پر تشریف فرما ہوتے تو سارا کام درویش خود

کرتے۔ اب قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ ہر قسم کے آدمی ہوتے یعنی اونٹ سوار، گھوڑے سوار، ٹانگے سوار، سائیکل سوار اور پیدل ، سب کے سب ایک وقت پر پہنچتے۔ صرف یہی نہیں کہ ہر دعوت پر کھانا ہی کھانا ہوتا بلکہ ذکر فکر، پند و نصائح اور محفلِ سماع کا سلسلہ گرم ہوتا۔ قبلہ و کعبہ خود وعظ فرماتے، علماء کرام جو شریکِ سفر ہوتے، وہ بھی تقریریں کرتے اور قوال پارٹیاں بھی برابر کا حصّہ لیتی تھیں۔ یہ دعوتوں کا سلسلہ اب بھی جاری ہے اور پروگرام میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اب فیصلہ آپ پر ہے ، کیا انہیں آپ دعوتیں کہیں گے یا کوئی اور نام دیں گے۔ جناب شیخ کا ہر طریقہ انوکھا اور ہر ڈھنگ نرالا تھا۔ جس وقت آپ تقریر فرماتے، ہر فرد یہ محسوس کرتا کہ یہ میرے حال پر کلام فرما رہے ہیں۔ ہر فرد جو کدورتیں اور جو سوال دل میں ہے، لے کر محفل میں بیٹھتا اور وعظ کے اختتام پر ہر ایک مطمئن ہوتا۔ کوئی سوال باقی نہ رہتا، کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوتی جو قابلِ غور ہو اور یہی کامل کا کمال ہوتا ہے۔ بیانِ توحید ہر وقت آپ فرماتے اور حدودِ شرعی کے خلاف

کرنے والوں کو سخت سزا دیتے، پابندئ وضو اور نماز پر زور دیتے۔ فرمانِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خود ایک مجسمہ تھے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقشِ قدم پر ہر مرید کو چلایا جاتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ محمد پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی میں نجات ہے مگر جب آپ اس موضوع پر لب کھولتے تو آنکھوں کے آگے محبوبِ پاک بیٹھے نظر آتے۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ جاننے والے اس حقیقتِ حال پر شاہد ہیں ۔

تیری مجلس مجلسُ اللہ تھی
دونوں عالم کی جہاں گم، راہ تھی
مجمع البحرین تجھ سا بعد ازاں
گردشِ دوراں نے دیکھا تھا کہاں

اب آپ کی عبادت کے بارے میں تھوڑا سا بیان کرنا چاہتا ہوں۔ نمازِ پنجگانہ کے علاوہ آپ تہجّد ادا فرماتے اور تقریباً ہر مرید کو اس کا حکم دیتے، رات کو نو بجے آرام فرماتے اور پھر ایک بجے بیدار ہوتے اور نمازِ فجر تک جائے نماز پر بیٹھے ذکر میں مشغول رہتے، اور اس

قدر روتے کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ رونے کی وجہ سے آپ کی آنکھوں کے نیچے چھوٹے چھوٹے سیاہ حلقے بن گئے جو کہ اکثر فقراء کے ہوتے ہیں۔ گریہ کو آپ بے حد پسند فرماتے۔ کوئی کتنا گنہگار ہوتا، آپ کے حضور میں پہنچ کر رونے لگتا تو فورًا معاف فرما دیتے، اور فرماتے کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے کہ سب نیکیوں اور اچھے کاموں سے مجھے گنہگار کے وہ آنسو جو میرے خوف و محبّت میں بہائے جائیں، بہت پسند ہیں کیونکہ یہ آنسو اس کے گناہوں کو دھو سکتے ہیں اور عذرِ نجات ہوسکتے ہیں۔

ہر جمعہ بڑا پر رونق ہوتا جس پر دور و نزدیک کے عقیدت مند اکٹھے ہوتے اور بعد از نمازِ جمعہ محفل آراستہ ہوتی جس مین نعت خوانی، شانِ پیر کی غزلوں کا خاص خیال و لحاظ ہوتا۔ یہ تمام سلسلہ بدستور اب بھی جاری ہے۔ اس کے علاوہ ماہِ محرّم کے تین دن ' آٹھ، نو، دس محرّم الحرام ، کو علماءِ کرام کو بلا کر واقعہ کربلا پر روشنی ڈالی جاتی، اور جتنے مصائب و آلام حضرت سیدنا امام حسین رضي الله عنه پر گزرے، ان کو

بیان کیا جاتا اور یادِ اسلام تازہ ہوتی۔ چونکہ جناب شیخ خود عاشقِ حبیب تھے، لہٰذا عشاق کے حالات سے بڑا پر لطف اٹھاتے اور کیوں نہ ہو، عشق کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ خدا تعالیٰ کو عشق نہ ہوتا تو یہ دنیا معرضِ وجود میں نہ آتی اور حضرت سیدنا موسیٰ علیٰ نبیّنا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کلیم اللہ ، حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ نہ بنتا اور میرا محبوب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حبیب اللہ نہ بنتا۔ ان سب کا ظہور عشق سے ہےاور پھر اس عشق کی ابتداء تسلیم و رضا اور عجز و نیاز ہے۔

اس بے نیاز نے اپنے حبیب لبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیا کیا آزمائشیں ڈالیں مگر حبیب پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اف تک نہ کی بلکہ پیکرِ تسلیم و رضا بن گئے۔ حضرت امام حسین رضي اللہ عنہ ہی کو دیکھیے ! کس قدر آزمائشیں آئیں، تمام کنبہ شہید ہوگیا، بچے پیاس سے بلکتے رہے،بیبیاں قیدی ہوئیں، غرضیکہ کوئی ایسا دکھ، کوئی غم مصیبت ایسی

نہ تھی جو امام عالی مقام پر نہ آئی لیکن جواب میں سوائے نیاز او رتسلیم کے کچھ نہ تھا۔

مقامات عشق

سبقِ عشق کی ابجد ہے اثر عجز و نیاز
یعنی اِک پیکرِ تسلیم و رضا ہوجانا
آخری باب میں ہے ذکرِ فنا فی المحبوب
یعنی محبوب کی الفت میں فنا ہوجانا
اس فنا میں ہے مگر جامِ بقا کی مستی
ہے یہی بندے کا ہم رنگِ خدا ہوجانا

آپ کی زندگی کے حالات کو قلم بند کرنا میرے تو بس کا روگ نہیں۔ اتنے واقعات ہیں، اتنی کرامات ہیں

جن کو تحریر کرنے کے لیے دفتر درکار ہیں۔ اور اگر دیکھا جائے تو

أَلْعِلْمُ نُقْطَةٌ كَثَّرَهَا الْجُهَّالُ۔ (12)

" علم تو محض ایک نقطہ ہے، جاہل لوگوں نے اس کو بہت بڑھا دیا ہے ۔"

حضرت سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کا یہ فرمان' سب دلائل، تمام ثبوت، لمبی تحریریں، فصیح و بلیغ تقریریں، سب اس ایک نقطہ میں آجاتی ہیں اور اس سے سکونِ دل اور راحتِ جان ملتی ہے۔

بندۂ مومن کو اللہ تعالیٰ بیماری، بھوک یا ذلت ، ان تینوں چیزوں سے نوازتا ہے۔ قبلۂ ام کو یہ دو چیزیں یعنی امراض و الزام عطا فرمائی گئیں۔ بظاہر ہماری نظر میں یہ چیزیں سزا ہیں اور اہل اللہ کی نظر میں عطا ہیں کیونکہ ہر وہ چیز جو محبوب کی طرف سے آئے ' خواہ

عتاب ہو یا ثواب، مسکراتے ہوئے قبول کرتے ہیں اور اس کے ہر فعل پر صابر و شاکر رہ کر اسے خوش کرتے ہیں۔ یہی اختلاف ہے اہل اللہ میں اور ہم میں ، ضبط و تحمل اور صبر و شکر سے ہم دور ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی نعمتوں سے ناشکری اور تکلیفوں میں بے صبری، یہ ہمارا شیوہ بن چکا ہے۔ حضور کو مختلف امراض لاحق تھیں اور شروع سے رہیں۔ ان امراض کے باوجود قبلۂ ام نے اپنی ذمہ داریوں میں فرق نہ آنے دیا اور نہ ہی تبلیغ میں۔ آخر میں آپ کو امراض نے گھیر لیا اور خدا کا یہ انعام بڑھتا گیا۔ پہلے تو آپ باہر تشریف لاتے رہے لیکن بعد میں کمزوری کی وجہ سے نہ آسکتے تھے۔

مکمل ایک سال تک آپ کو بہت تکلیف رہی۔ اس شمع حقیقی کی زیارت کے لیے ہر وقت پروانوں کا ہجوم رہتا اور وقتاً فوقتاً تمام لوگوں کو گھر میں بلا کر زیارت کرائی جاتی۔ بروز جمعہ قریب و بعید سے آئے ہوئے تمام مریدین گھر میں بلوائے جاتے اور آپ ان سب کو تھوڑی سی تبلیغ فرماتے اور اپنے اس جہان کو چھوڑنے کے متعلق اشاروں ہی اشاروں میں بتا دیتے اور فرماتے

کہ میرے بعد یہ میرا بتایا ہوا علم و عمل کسی قیمت پر ترک نہ کرنا۔ اسی میں تمہاری فلاح ہے اور نجات ہے۔ یہ علم میرا نہیں بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم ہے۔ اس رسی کو مضبوط پکڑے رکھنا اور تا دمِ زیست نہ چھوڑنا۔ ان ملاقاتوں کا سلسلہ ایک سال تک یونہی جاری رہا اور پھر آپ کو علاجِ خاص کی خاطر مریدینِ لاہور کے اصرار پر لاہور لے جایا گیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا اور آپ واپس تشریف لے آئے۔

اور آپ نے آخری تقریر جو سرِ اجلاس فرمائی، وہ صحنِ دربار میں بڑ کے ایک چھوٹے پودے کے نیچے ’جو خود حضور نے بڑے بَڑ‘ کے گرنے کے بعد لگایا تھا‘ فرمائی۔ آپ نے تقریر کے اختتام پر بڑ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے بڑ! تم بھی شکوہ نہ کرنا کہ میرے سائے میں ذکرِ حق نہ ہوا۔ میں تمہارے گلے شکوے ختم کرنے کے لیے یہاں وعظ کررہا ہوں۔ یہ آپ کا الوداعی وعظ اس قدر پر اثر اور لبریز از ذوق و شوق تھا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ پھر آپ کی صحت دن بدن گرتی چلی گئی۔ ماہِ محرّم الحرام آیا، حضور کی تکلیف

کی وجہ سے محفلِ امام حسین رضي الله عنه منعقد کرنے کا کوئی پروگرام نہ تھا لیکن جب وہ تاریخیں آئیں تو حضور نے تمام کو ڈانٹا کہ میرے مریض ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ذکرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ذکرِ حسین رضي الله عنه ترک کردیا جائے، لہٰذا یہ پروگرام اسی وقت مرتب ہوگیا اور علماءِ کرام نے واقعۂ کربلا پر روشنی ڈالی۔

یہاں ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر اسماعیل اختر نامی لائل پور سے جناب کے علاج کے لیے آیا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے قبلہ گاہی سے یہ سوال کیا کہ مِیری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ جو بھی اللہ کی طرف جائے یا اس کے راستے پر گامزن ہو، اللہ تعالیٰ اسے تکلیف، بیماری یا بھوک وغیرہ، اس قسم کی مصیبتوں میں مبتلا فرما دیتا ہے ۔ حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ جو بھی اس راستے پر آئے، اسے ہر قسم کی نعمتوں سے مالا مال کردیا جائے تا کہ دوسرے لوگ بھی اسے دیکھ کر رشک کریں او اس طرف رجوع کریں کہ بھئی اس آدمی کو اللہ تعالیٰ کے راستے پر جانے سے

کس قدر خوش حالی ہوئی، ہمیں بھی جانا چاہیے لیکن باری تعالیٰ اس کے بر عکس کرتا ہے ؟

حضور نے اس سوال کا جواب اس طرح بیان فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب! بات در اصل یہ ہے کہ اگر آزمائش، تکلیف و مصائب نہ ہوں تو ہر شخص نبوّت اور ولایت کا دعویٰ کرنے لگے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہ ایک کسوٹی بنائی ہے کہ جو صادق ہیں، وہ ثابت قدم رہیں گے اور جو کاذب ہیں، وہ دُم دبا کر بھاگ جائیں گے۔دوسرا یہ کہ ہر ایک اپنوں ہی سے پیار کرتا ہے، اپنوں ہی سے کام لیتا ہے اور غیروں کو کبھی کچھ نہیں کہتا کیونکہ جو اپنے ہوتے ہیں‘ وہ اپنوں کے کسی فعل پر اعتراض نہیں کرتے اور بیگانے تو بیگانے ٹھہرے، جن سے کوئی امید نہیں رکھی جا سکتی، لہٰذا وہ پیاروں کو زیادہ دکھ دیتے ہیں کہ مجھے بھولیں نہیں، اور غیروں کو سکھ دیتا ہے کہ وہ عیش و آرام میں کھوجائیں اور مجھ سے غافل رہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جب ایک محبوب بنا لیا جائے تو محب کو چاہیے کہ وہ اسی کا ہوجائے اور تا دمِ زیست اس کی چوکھٹ سے سر نہ اٹھائے۔

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بار منّتِ درباں کیے ہوئے

اور عہدِ وفا کو نبھانے کی کوشش کرے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ وفا دار پر کتنے حملے ہوتے ہیں۔ ان کو اپنی جان محبوب کے مقابل مہنگی نہیں ہوتی کیونکہ ان کا سب کچھ وہی ہوتا ہے جسے وہ سوچ سمجھ کر دل دیے ہوئے ہیں۔ پھر یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنا قدم پیچھے ہٹائیں۔ یہاں آپ نے ایک ہندی شعر فرمایا کہ ایک شخص کا گزر ایسے درخت کے پاس سے ہوا جو جل رہا ہے، اور اس پر ایک پرندہ بیٹھا ہے، لہٰذا وہ شخص حیران ہو کر کہتا ہے۔

آگ لگی اس برچھ کو، جلنے لاگے پات
اڑ جا بھولے پنچھیا، پر ہیں تمہارے ساتھ

پرندے نے جواب دیا:

پھل کھائے اس برچھ کے بٹیوں بھرے پات
اڑنا کام نہیں اب اپنا، جل مرنا ہے ساتھ

اس نے کہا کہ کیا ہوا ، تمام عمر میں نے اس درخت پر گزار دی اور اس کے پھل کھاتا رہا اور ہر قسم کی سہولت میسّر آتی رہی۔ اب اگر میرے اس محسن پر وقت آیا تو میری وفا کیا ہوئی کہ اسے جلتا چھوڑ کر کیسے اڑ جاؤں، اب تو اس کے ساتھ مریں گے، اسی کے ساتھ جیئیں گے۔ وفا بھی کوئی چیز ہے۔ آپ کے اس جواب کا ڈاکٹر صاحب کے دل پر بھی بڑا اثر ہوا اور اس نے گریہ شروع کردیا، اور تقریباً چار پانچ گھنٹے یہی حالت رہی۔

ہمیشہ مؤثر بات اس کی ہوتی ہے جس کا قول، اس کے فعل کے موافق ہو، علم، عمل کے خلاف نہ ہو، بے طمع ہو اور یہ سب چیزیں ولی کامل میں پائی جاتی ہیں۔ ہاں تو محرّم الحرام کی محفلیں ختم ہوگئیں۔ آپ

کی طبیعت نہ سنبھلی لیکن کسی کو یہ گمان نہ گزرتا تھا کہ جناب والا ہماری گنہگار نظروں سے پوشیدہ ہونے کو تیار ہیں۔آپ صاف صاف لفظوں میں ہمیں بتاتے رہے لیکن ہمیں یقین نہ آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو ہم لوگ متقین میں سے نہ تھے اور دوسرے کسی کا دل کب چاہتا ہے کہ اس کا محبوب اس سے جدا ہو۔ اور ہمارا یہ محبوب بھی انوکھا تھا جس سے ہماری زندگیاں وابستہ تھیں، جس کے سہارے شاہ و گدا جی رہے تھے، جو ہمیں اندھیروں سے بچانے کے لیے مشعلِ راہ تھا۔ یہ سوچتے کہ اگر خدا نخواستہ یہ مشعل گل ہوگئی تو بس اس سے زیادہ قوّتِ سوچ و بچار نہ ہوتی اور گھناؤنے اندھیرے ہمیں ڈسنے کو دوڑتے۔ ہم انہی اندھیروں میں ڈوب جاتے لیکن پھر جب اس حسین چہرہ پر نگاہ پڑتی، ان پیاری خوب صورت گول آنکھوں سے آنکھوں کی مڈ بھیڑ ہوتی، ہر بار اس رخِ مہتاب کے نئے انداز ہوتے، ان روشن آنکھوں سے نئے راستے کھلتے نظر آئے جو ہمارے لیے باعثِ تسکین و اطمینان ہوجاتے۔

ہنسا ہنسا کے شبِ وصل اشکبار کیا
تسلیاں ہمیں دے دے کے بے قرار کیا

تین چار دن اسی کشمکش میں گزرے۔ آخر وہی ہوا جس کا ہمیں ڈر تھا، وہی غم کا پہاڑ ہمارے اوپر گرنے کو تیار تھا۔ قبلہ محترم نے بندۂ حقیر سے کئی بار وقت‘ دریافت فرمایا، اور بار بار پوچھتے رہے کہ لنگر تقسیم ہوا ہے یا نہیں؟ یہ واقعہ پندرہ محرّم الحرام کا ہے۔
میری مضطرب نگاہیں کئی بار ٹائم پیس کی طرف اٹھیں اور سوچتا کہ آپ بار بار وقت کیوں پوچھ رہے ہیں؟
گیارہ بجے دن بندہ نے کچھ خوراک حضور کو دی جو کہ مجھے ہی کھلانے کا حکم ہوا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے چند چمچے چاول کے جناب کے دہنِ مبارک میں دیے اور پھر آپ مجھ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ میری قسمت میں اس دنیا پر یہ آخری طعام ہے۔ میں نے کچھ اور کھانے کو کہا تو فرمانے لگے: جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں، تمہیں کیا خبر، بس اب تنگ نہ کرو۔ اس کے بعد آپ نے لنگر کے بارے میں دریافت فرمایا۔ عرض کی گئی کہ جناب! لنگر تو تقسیم ہوچکا ہے۔ فرمانے لگے:

بہت اچھا ہوا، اس لنگر کو اسی طرح جاری رکھنا کیونکہ تمام نیک اعمال سے یہ بڑھ کر ہے۔ پھر آپ نے وقت پوچھا۔ اس وقت پونے دو بجے تھے۔ چند لمحوں کے بعد حضور نے اپنی زبانِ درفشاں سے فرمایا:

" الحمد اللہ!
کہ محبوب سے ملاقات کا وقت آگیا ہے۔"

اور قبلہ و کعبہ ۱۵ محرم الحرام بروز پنج شنبہ (جمعرات) ۱۳۸۱ ھ بمطابق 29 جون 1961ء ہم سے رخصت ہوگئے۔

ہر ایک کا یہ خیال تھا کہ جو غم کا بارِ گراں ہم سب کے اوپر آن پڑا ہے، اس کا برداشت کرنا بڑا مشکل ہے اور ہم میں سے ضرور کوئی نہ کوئی ہوش و حواس کھو بیٹھے گا، لیکن اللہ تعالیٰ نے وہ رحمت فرمائی کہ سب کے سب بالکل درست رہے۔ اگلے دن جمعہ تھا اور جناب کے وصال کی یہ خبر ہوا کی طرح پھیل گئی، اور صبح تک تمام عزیز و اقارب اور جماعتِ مریدین' آستانہ

عالیہ پر پہنچ گئے۔ اس قدر مخلوق میری نظروں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ زمین پر تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ خیر آپ کو تجہیز و تکفین کے بعد باہر لایا گیا۔ آنکھوں کے آگے مہیب سائے گھوم رہے تھے۔ یہ مکان، یہی دیواریں، یہی گلستان جنہیں دیکھنے سے مسرّت ہوتی تھی، اب یہی ہمیں گھور رہے تھےاور انہی سے ڈر لگتا تھا۔ آپ کے جسد خاکی کو جنازہ گاہ میں لایا گیا جہاں جنازہ پڑھا گیا۔ جس طرف دیکھو، خلقِ خدا ہی نظر آتی تھی۔ اتنے بڑے ہجوم کو آخری زیارت کروانا ہی مشکل ہوگیا تھا اور بہت لوگ ایسے بھی رہ گئے جو زیارت سے مشرف نہ ہوسکے۔ بہت لوگ شرکتِ جنازہ بھی نہ کرسکے، حالانکہ جمعرات دو بجے وصال ہوا، اور جمعہ دس بجے آپ کا جنازہ پڑھا گیا۔ اس کے بعد حضور کو مرقد شریف میں دفن کردیا گیا، اس طرح آپ اپنے پروانوں کو تڑپتا چھوڑ کر اپنے محبوب حقیقی کے پاس پہنچ گئے۔

یہ ٹھیک ہے کہ مردانِ خدا تعالیٰ کبھی نہیں مرتے لیکن بظاہر ہماری آنکھوں سے تو دور ہوجاتے ہیں، اور

یہ داغِ مفارقت بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ وقت بڑا مرہم ہے۔ بڑے سے بڑا مرہم بھی مندمل ہوجاتا ہے لیکن وہ خلا جو ایسی ہستی کے چلے جانے سے ہوجاتا ہے، اسے پُر کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔

حضرت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دارِ فانی سے جب پردہ پوش ہوئے تو اس وقت دینِ اسلام مکمل تھا، لیکن ایسا خلا پیدا ہوگیا جو پُر ہونا بڑا مشکل ہوگیا تھا۔ گو خلفاءِ راشدین نے بڑی تندہی سے کام کیا لیکن پھر بھی وہ خلش جو تمام قوم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے دل میں تھی، دور نہ ہوسکی۔ اسی طرح ہم انہیں بھول تو جائیں لیکن ان کو بھولنا بھی آسان نہیں کیونکہ جس نے ہمیں خدا تعالیٰ کا راستہ بتایا، ظلمت سے نور کی طرف لایا، علمِ الٰہی سے روشناس کرایا، اس کے احسانات کا ہم پر بوجھ اتنا ہےکہ ہم لاکھ کوشش کریں، اتار نہیں سکتے۔ اگر احسان کا بدلہ ہے تو

” هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۔“ (13)

احسان کا بدلہ احسان ہم صرف یہ کرسکتے ہیں کہ اس کی نعمتوں کا شکر سے جواب دیں اور اُس کے بھیجے ہوئے اِس قاصد کی یاد دِل سے تاعمر لگائے رکھیں جس نے ہمیں سرکشی کے دریا میں غرق ہونے سے بچا لیا، ہمارے حالات سنوار دیے، اسے بھولنا ہمارے بس کا روگ نہیں۔ اور دعا ہے کہ کوئی بھی ایسی ہستی کو نہ بھولے جسے بھولنے سے اللہ تعالیٰ ناراض اور جسے یاد رکھنے سے خداوند کریم خوش ہوتا ہے۔ میں سب کچھ بھول جاؤں گالیکن اپنے شیخ کے پیار، ان کی باتیں کبھی بھی نہ بھول سکوں گا۔

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
اِلّا حدیثِ دوست کہ تکرار مے کنیم

”ہم نے جو بھی پڑھا ہے، اسے بھلا دیا ہے ، سوائے محبوب کی پیاری باتوں کے کہ ہم اس کا تکرار کرتے رہتے ہیں ۔“

قبلۂ ام کے وصالِ پرملال کے بعد اس سجادۂ شریعت و طریقت کی سپرد داری بھی کسی ایسی شخصیت کے ذمہ ہونی چاہیے تھی جو اس قابل ہو کہ اس عظیم مشن کے ہر پہلو پر پورا اترے اور عقیدت مندوں کے دینی و دنیاوی مقاصد کا ذمہ دار ہو، بے کس و ناچار‘ راہ روؤں کا راہبر بن سکے، ان کو دنیا اور راہِ سلوک کی پر خطر گھاٹیوں اور نشیب و فراز سے آگاہ کرے، اور ان شکستہ دلوں کے لیے تسکین و اطمینان کا سامان میسّر کرے جو اپنی شمعِ الفت کھو چکے تھے، جن کے اندھیرے گھروں کا‘ حسین چراغ راہی ملکِ بقا ہوگیا، اور اس نورِ ہستی کو دیکھنے والی آنکھیں شرفِ دیدار سے محروم ہوچکی تھیں۔

اب ایسی شمع چاہیے تھی جو اس شمعِ حقیقی سے روشن کی گئی ہو، ایسا ہاتھ چاہیے تھا جو ید اللہ کا

مصداق ہو، ایسی موج کی ضرورت تھی جو ڈوبنے والوں کو دھکیل کر ساحلِ مراد تک پہنچا دے، چنانچہ ایسی شخصیت کو تلاش نہ کرنا پڑا، کسی سہارے کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ یہ کام مرشدی و مولائی اپنی حیاتِ با برکات میں ہی مکمل فرما گئے تھے۔

یعنی مکرّم و محترم پیر سیّد محمد نواز شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ’ جو صحیح معنوں میں اس سجادگی کے مستحق تھے، کی تقلید اور اتباع کا فرمان زبانِ دُر فشاں سے ہر خاص و عام مرید کے لیے ہو چکا تھا، اس میں کسی کو کوئی اعتراض نہ تھا، کوئی الجھن نہ تھی۔ تمام متبعین یعنی پیروکار اس امرسے راضی و خوش تھے کہ شیخ ہم پر کتنا مہربان ہے۔ اپنے اس جہان سے رخصت ہوجانے کے بعد بھی ہم پر وہی ملاطفت فرمائی جو بقیدِ حیات ہونے پر فرمایا کرتے تھے، یعنی ہمارے ہاتھ ایسے ہاتھ میں سونپے جو ان تک پہنچا ہوا تھا۔ چنانچہ تمام مریدین نے حسبِ دستور دستِ بیعت کرنا شروع کردیا اور یہ سلسلہ پھر سے جاری ہوگیا۔ پیر و مرید کی نسبت تازہ ہوئی۔ یہ نسبت بھی عجیب ہے کہ تمام عزیز

و اقارب سے زیادہ‘ پیر کو مرید سے اور مرید کو پیر سے پیار و محبت ہوتا ہے۔

شاید حضور سے کوئی نسبت ہمیں بھی ہو
آنکھوں سے جانچ کر ہمیں پہچان جائیے

تعلقات کئی قسم کے ہوتے ہیں، عزیز و اقرباء سے تعلق، دوستوں سے تعلق وغیرہ وغیرہ۔ اس دنیا میں کوئی شئے بھی تعلق کے بغیر نہیں جیسے کہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

تعلّقات کی غارت گری کا حال نہ پوچھ
کہ دن کے نُور کا بھی رات سے تعلق ہے

لیکن جو نسبت یا جو رشتہ یا جو تعلق شیخ اور مرید کا ہوتا ہے، وہ تمام سے انوکھا اور عجیب ہوتا ہے۔ یہ رشتہ دھاگے کی طرح کچّا اور لوہے کی طرح مضبوط ہوتا ہے، یعنی اگر یقینِ کامل نہ ہو، ایقان خام ہو، خلوصِ قلب سے دور ہو تو یہ تعلق کسی وقت بھی ٹوٹ سکتا

ہے۔ شیخ سے متعلق کوئی ایسی بات سنی جو اپنی دانست میں درست نہیں تو جھٹ اعتراض کر ڈالا۔ جب مرید کی طرف سے اعتراض ہوگیا تو سمجھیے، یہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ جو اس سے نقصان ہوا، معترض ہی کو ہوا، اور اس نقصان کی تلافی بہت مشکل ہے کیونکہ حدیثِ قدسی کا مفہوم ہے:

جو کوئی میرے بندوں پر اعتراض کرے گا، میرے دوستوں کو ستائے گا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ میرا دشمن ہے، اور خبردار! جو خدا کا دشمن ہے، وہ عذابِ شدید کے لیے تیار ہوجائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ واقعی یہ نافرمانی قابلِ معافی نہیں لیکن اگر وہ پھر دل سے جھک جائے اور توبہ خالص کرے تو اللہ تعالیٰ درگزر فرما دیتا ہے۔ محبت خالص نہ ہونے کی وجہ سے یہ تعلق خام دھاگے کی طرح ہے اور اگر ایمان کامل ہو، محبتِ شیخ میں سر تا پا غرق ہو تو وہ ایک پہاڑ کی مانند ہے جسے طوفان و حوادث کا کوئی خوف و خطر نہیں۔ شیخ کے متعلق لاکھوں شکوے، کروڑوں گلے یا قابلِ اعتراض باتیں سننے سے اس کے ایمان میں رائی

برابر فرق نہ آئے گا۔ لہٰذا چاہیے کہ جس جگہ اس جبینِ نیاز کو جھکایا گیا ہو، اسے تا دمِ زیست نہ اٹھائے، خواہ کتنی ہی تکلیفیں ، رنج و الم اٹھانے پڑیں، لیکن ایمان کے قدم ڈگمگانے نہ پائیں۔

میں نے رکھ دی ہے جبیں، دیکھ کے اِک ماہِ جبیں
جھک گئی ایک جگہ پر، تو اٹھاؤں کیسے ؟

آپ نے اپنا کوئی خلیفہ مقرر نہیں کیا۔ اکثر لوگوں نے اس کے متعلق عرض کیا کہ قبلہ آپ ضرور کسی نہ کسی کو خلافت عطا فرمادیں کیونکہ اس سے دینِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغ اور زیادہ ہوگی اور لوگوں کو اسلام کے اور خدا تعالیٰ کے قریب ہونے کا موقع ملے گا لیکن آپ فرماتے کہ یہ گنج ہائے گرانمایہ میں کس کو سونپوں جب کہ کوئی اس قابل ہی نظر نہیں آتا۔

فرماتے: مجھے تو بے حد شوق ہے کہ دینِ نبوی جس قدر پھیل سکے، پھیلایا جائے لیکن میری نظروں میں

کوئی ایسا شخص نہیں جس کو اس کام پر متعین کیا جائے۔

ہماری نظروں میں تو جناب کی جماعت میں کافی عالم و عامل ہیں لیکن جو کچھ ایک محبوبِ خدا ولی اللہ کی نگاہِ پاک دیکھ اور سمجھ سکتی ہے، وہ عام نظریں نہیں دیکھ سکتیں۔ آپ ہمیشہ یادِ الٰہی میں ہر وقت مصروف رہنے کی تاکید فرماتے اور عابدوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔

اب رشد و ہدایت کی ذمہ داری قبلہ سجادہ نشین حضرت سیّد محمد نواز شاہ کو سونپی گئی اور اس تمام ذمہ داری کا بارِ گراں اب انہیں پر ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ ان تمام ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے نبھا رہے ہیں اور باقاعدہ دو وقت قبلہ و کعبہ کی طرح حسبِ معمول کچہری میں بیٹھتے ہیں، محفل آراستہ ہوتی ہے، اور ذکرِ الٰہی ہوتا ہے۔

حضرت شیخ فرمایا کرتے تھے کہ میری باتوں کو اپنے دلوں اور دماغوں میں محفوظ کر لو، ان باتوں کی گٹھڑیاں باندھ لو تا کہ میرے بعد تمہارے کام آسکیں۔ اور یاد رکھو کہ یہ درس و تدریس کا سلسلہ گو جاری رہے گا لیکن جو کوشش میں تمہارے ساتھ کر رہا ہوں اور جس محبت و پیار کے رنگ میں میں تمہیں رکھنا چاہتا ہوں، وہ کبھی نہ پا سکو گے۔

قبلۂ ام کی یہ پیش گوئی بالکل صحیح ہے۔ یہ درست ہے کہ آج بھی اس دربار پر ذکرِ اللہ و ذکرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کمی نہیں لیکن یہ سچ ہے کہ وہ بہتات بھی نہیں پائی جاتی۔ جس وقت وہ بحرِ بے کنار اپنی موج میں آتا تھا تو کئی لعل و جواہر اپنے دامن سے باہر پھینکتا لیکن یہ حسرت دل میں رہے گی کہ ان جواہرات کا قدر دان کوئی نہ مل سکا۔

ع قدرِ زر، زرگر بداند، قدرِ جوہر جوہری

اب بھی ان شاء اللہ! یہ آستانہ اسی شان و شوکت سے موجود ہے اور یہ ستارہ اب بھی ویسا ہی روشن ہےاور اپنی چمک دمک سے گمراہوں اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہِ کج سے ہٹا کر راہِ راست پر لانے کے لیے ہر وقت کوشاں ہے اور دعا ہے کہ یہ آستانۂ عالیہ اسی طرح قائم و دائم رہے۔ آمین ثم آمین

شیخ و صوفی رند و زاہد پارسا
سینکڑوں ہیں پر کہاں مردِ خدا

مردِ خدا ہونا بہت دور ہے۔ خدا کی مخلوق میں ہزاروں لوگ ہیں جن میں صوفی بھی ہیں، زاہد و پارسا سب موجود ہیں۔ ایسے صاحبِ کرامات فقیر بھی ہیں کہ ان کے حالات و واقعات دیکھ کر، سن کر حیرانی ہوتی ہے لیکن مردِ خدا کا جو لفظ ہے، وہ اپنے اندر بہت خوبیاں رکھتا ہے اور واقعی یہ منزل، یہ مقام، یہ مرتبہ بہت ہی بلند ہے۔ یہاں یہ ایک حکایت کے ذریعے میں آپ پر واضح کرنے کی کوشش کروں گا کہ مردانِ خدا کس قدر بلند پایہ اور عظیم المرتبت شخصیت ہوتے ہیں۔

حضرت غوث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ قلندر' پھرتے پھرتے ایک شہر میں پہنچے، رات ہوچکی تھی، ایک مسجد میں آپ نے قیام فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں کہ جب میں مسجد میں پہنچا تو ایک فقیر سے ملاقات ہوئی جو لنگوٹی پہنے تھے۔ انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میاں غوث علی شاہ! یہ میری لنگوٹی لے جاؤ اور ابھی دھلوا کر لے آؤ۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! یہ کون سا وقت ہے دھلوانے کا، اس وقت مجھے کون دھو کر دے گا؟ فقیر نے فرمایا کہ شہر کے دروازے سے باہر نکل کر دیکھ لو، شاید کوئی مل جائے۔ قلندر صاحب فرماتے ہیں کہ میں اٹھا اور اس طرف چل پڑا۔ جب میں شہر کے دروازے کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شہر کے باہر دھوپ چمک رہی ہے اور یہی کوئی آٹھ نو بجے کا وقت ہے۔ خیر میں نے چند قدم آگے اٹھائے تو وہاں ایک دھوبی گھاٹ نظر آیا۔ بہت سے دھوبی کپڑے دھو رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی سب بیک آواز بولے کہ لاؤ، میاں صاحب کی لنگوٹی دھو دیں۔ میں نے ان میں سے ایک کو دی اور دھلوا کر

واپس چلا آیا۔ پھر جب دروازہ شہر کے اندر داخل ہوا تو رات کا سماں ہے۔

شہر کے باہر دیکھو تو دن، اندر دیکھو تو رات۔ اسی الجھن میں کہ عجب بات ہے، میں مسجد میں پہنچا۔ فقیر صاحب بیٹھے تھے، میں نے لنگوٹی انہیں دے دی اور پوچھا کہ صاحب! یہ تماشا کیا ہے جو میری آنکھوں نے دیکھا ہے؟ فرمانے لگے: یہ تو سوانگ ہیں، تم اتنے کیوں پریشان ہو؟ میں نے کہا: صاحب! یہ تو بہت بڑی کرامت ہے۔ فرمایا: یہ ٹھیک ہے لیکن مردِ خدا ہونا بڑا دور ہے۔ یہ تو مداری کا تماشا ہے جو ہر فقیر کر لیتا ہے۔ اس حکایت میں گو کسی مردِ خدا کی تعریف تو نہیں کی گئی لیکن اس سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ مردِ خدا کا شان اس سے بھی بلند ہے اور یہی ان کی تعریف ہے، لیکن

شاذ و نادر کوئی شہ باز حلال
کھولتا ہے اس ہوا میں پر و بال

قبلہ گاہی میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی تھیں جو کہ ایک مردِ خدا میں ہونی چاہییں۔ یعنی ہمیشہ آپ اسرارِ نہانی کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے لیکن اِسی چھپانے ہی چھپانے میں سب کچھ کہہ جاتے۔

مرحبا اے خازنِ اسرارِ غیب
کیا چھپایا ہے ہنر کو مثلِ عیب

یہاں پہ ایک واقعہ نقل کرتا ہوں جو کہ قبلہ و کعبہ کے مقرّبِ خاص میاں غلام رسول خان ویروآنہ کی وساطت سے مجھ تک پہنچا۔ میاں غلام رسول جو کہ 1939 ء سے ہی قبلۂ عالم کی غلامی میں ہیں، بقول ان کے" مجھے مولوی فضل الحق نے ' جو کہ قصبہ جکھڑ میں علمِ طب کے ماہر، پیر سیّد مہر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے عقیدت مند اور فیض یاب، اور مجھ سے کافی مانوس تھے، اپنے پاس بلوا بھیجا۔
چنانچہ بندہ حضرت شیخ سے رخصت حاصل کرکے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لمحاتِ فرصت میں مجھ سے مخاطب ہوئے کہ میں نے آج تمہیں ایک رازِ مخفی کے

انکشاف کرنے کے لیے بلوایا ہے۔ یہ بات عام کھولنے کی نہیں لیکن میں تمہیں بتانا مناسب سمجھتا ہوں۔ مجھے شیخِ کامل نے علمِ معرفت عطا فرمایا ہے جس کی روشنی میں' میں نے تمہارے شیخ کا مقام ملاحظہ کیا ہے۔ تمہارے قبلہ و کعبہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک جنگل میں ہزاروں جانور ہوتے ہیں، لیکن سب کا سردار شیر ہوتا ہے۔ اور پھر ان شیروں میں سے ایک شیر ایسا بھی ہوتا ہے جو ان تمام پر فوقیت رکھتا ہے۔ تم یقین جانو کہ زمانۂ حال کے تمام فقراء میں تمہارے شیخ کا مقام بالکل اسی طرح ہے۔ میں تمہیں انس و شفقت کی وجہ سے بتا رہا ہوں اور یاد رکھو، اپنے شیخ کو کبھی نظرِ غیر سے نہ دیکھنا۔ خیر میں وہاں سے فارغ ہوکر آستانۂ عالیہ پر پہنچا۔ مرشدی و مولائی کچہری میں رونق افروز تھے۔ فرمایا: کیا کہا ہے فضل الحق نے؟ بندہ نے تمام عرض کیا جو سنا تھا۔ فرمانے لگے: اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ کسی کا رازِ مخفی اس طرح بیان کرتا رہے۔ پھر حضور خاموش ہوگئے۔

تو نہ تھا کچھ عین، عین اللہ تھا
ظاہرًا بندہ، نہانی شاہ تھا
بندگی کے بھیس میں اے جامۂ زیب
دے گیا واللہ تو سب کو فریب

مردِ خدا کی حقیقت بیان کرنا بڑی ہی مشکل بات ہے اور نہ ہی ہوسکتی ہے۔ لہٰذا میں اپنے انہی الفاظ پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اور ساتھ ہی یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ہر مسلمان کو ایسی نظریں نصیب فرمائے جو مردِ حق شناس کی شناسا ہوں کیونکہ انہیں کی پہچان سے حق کی پہچان ہوسکتی ہے، اور انہی کے نقشِ قدم پر چلنے سے فلاحِ دارین ہے۔ آج کل ایسے لوگ بھی پیدا ہوچکے ہیں جو اس شمعِ ہدایت کو بجھانے کے درپے ہیں۔ ان مردانِ خدا پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر ان لوگوں کے بنائے کچھ نہ بنے گا۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام ہمیشہ سے بلند ہوتا رہا ہے اور تاابد بلند ہی رہے گا۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ

سیّد محمد ظفر قادری رحمۃ اللہ علیہ